آرا وافکار

ڈاکٹر محی الدین غازی*

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر (۴)

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کے افادات کی روشنی میں

(۴۱) ایقن اور استیقن کے درمیان فرق

ایــقــن کا مطلب ہے یقین کیا، یہ ایمان سے قریب لفظ ہے، اور قرآن مجید میں اس کا استعمال بھی اس طرح کے مقامات پر ہوتا ہے جہاں ایمان کا استعمال ہوتا ہے۔ قرآن مجید کے استعمالات بتاتے ہیں کہ ایقان مومنوں کی ایک قابل تعریف صفت، بلکہ ایمان کا مترادف ہے، اس کی بہت ساری مثالیں ہیں، جیسے:

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ۔ (البقرۃ:۴)

اور جو لوگ ایقان کی روش اختیار نہیں کرتے ہیں ان کی قرآن مجید میں مذمت کی گئی ہے، ذیل کی آیت اس کی ایک مثال ہے:

فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوقِنُونَ۔ (الروم:۶۰)

ایقان مختلف صیغوں میں قرآن مجید کے متعدد مقامات پر آیا ہے اور ایک ایسے عمل کے طور پر آیا ہے جس کا مطالبہ بندوں سے کیا جاتا ہے، البتہ استیقان مختلف صیغوں کے ساتھ قرآن مجید میں صرف تین مقامات پر آیا ہے، اور تینوں مقامات پر وہ کسی قابل مذمت یا قابل تعریف عمل کے طور پر نہیں پیش کیا گیا ہے۔ استعمالات قرآنی کے اس واضح فرق کو سامنے رکھتے ہوئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ معنوی لحاظ سے بھی دونوں کے فرق کو سمجھا جائے۔ عام طور سے لوگوں نے استیقان کو مبالغہ کے ضمن میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، کہ ایقان کے مقابلے میں چونکہ دو حرف یعنی سین اور تاء اس میں زیادہ ہوتے ہیں اس لئے اس کے مقابلے میں یہاں مفہوم میں قوت بھی بڑھ جائے گی۔ لیکن یہ عام قاعدہ نہیں ہے، مزید یہ کہ دونوں الفاظ کے قرآنی استعمالات اس فرق کی تائید بھی نہیں کرتے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی کی رائے کے مطابق ایقن کا مطلب ہوتا ہے یقین کر لیا، جب کہ استیقن کا مطلب ہوتا ہے یقین ہو گیا یا یقین آ گیا۔ یقین کرنا بندے کا عمل ہے جسے وہ دلائل وشواہد کی روشنی میں اختیار کرتا ہے، جبکہ یقین ہونا

* ہیڈ آف ریسرچ دار الشریعۃ متحدہ عرب امارات۔ mohiuddin.ghazi@gmail.com

ایک کیفیت کا نام ہے جواز خود دل پر طاری ہوتی ہے، اس میں انسان کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہوتا ہے۔ اس لیے ایسا ہوسکتا ہے کہ آدمی کو یقین آجائے مگر وہ یقین کرنے کے بجائے جھٹلا دے۔ سورہ نمل کی آیت ۱۴ میں اسی صورتحال کو بیان کیا گیا ہے۔ اگر دل میں یقین ہے اور آدمی اس کا اقرار بھی کرتا ہے، تو یہ ایقان ہے، لیکن اگر دل میں یقین ہے مگر آدمی انکار پر مصر ہے، تو یہ استیقان تو ہوسکتا ہے، ایقان نہیں ہوسکتا ہے۔ غرض ایقان اور جحود ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، جبکہ استیقان اور جحود ایک ساتھ ایک ہی شخص کے اندر جمع ہوسکتے ہیں۔

بہت سے مترجمین نے ذیل کی آیتوں میں استیقن کا ترجمہ یقین ہوگیا کیا ہے اور وہی درست ہے، جبکہ بعض مترجمین نے ''یقین کرلیا'' کیا ہے جو استیقن کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ ذیل میں دونوں طرح کے ترجمے ذکر کیے گئے ہیں۔

(۱) وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْماً وَعُلُوّاً۔ (النمل:۱۴)

''اور انہوں نے ظلم اور تکبّر کے طور پر ان کا سراسر انکار کر دیا حالانکہ ان کے دل ان (نشانیوں کے حق ہونے) کا یقین کر چکے تھے''۔ (طاہر القادری)

''اور ان کے منکر ہوئے اور ان کے دلوں میں ان کا یقین تھا ظلم اور تکبر سے''۔ (احمد رضا خان)

دوسرا ترجمہ صحیح ہے، کیونکہ یہاں یہ نہیں بتایا جارہا ہے کہ وہ یقین بھی کرتے تھے اور انکار بھی کرتے تھے، بلکہ یہ کہ دلائل کی وجہ سے دل میں تو یقین بیٹھ چکا تھا، مگر ظلم اور تکبر کے سبب وہ اس کی تصدیق کرنے اور اس پر ایمان لانے کے بجائے انکار کررہے تھے۔

(۲) وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا مَلَائِكَةً وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ إِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَيَزْدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَاناً وَلَا يَرْتَابَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْمُؤْمِنُونَ وَلِيَقُولَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ وَالْكَافِرُونَ مَاذَا أَرَادَ اللَّهُ بِهَذَا مَثَلاً كَذَلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِي مَن يَشَاءُ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ وَمَا هِيَ إِلَّا ذِكْرَى لِلْبَشَرِ۔ (المدثر:۳۱)

''اور ہم نے دوزخ کے داروغے صرف فرشتے ہی مقرر کئے ہیں اور ہم نے ان کی گنتی کافروں کے لئے محض آزمائش کے طور پر مقرر کی ہے تاکہ اہلِ کتاب یقین کرلیں (کہ قرآن اور نبوتِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حق ہے کیونکہ ان کی کتب میں بھی یہی تعداد بیان کی گئی تھی) اور اہلِ ایمان کا ایمان (اس تصدیق سے) مزید بڑھ جائے، اور اہلِ کتاب اور مومنین (اس کی حقانیت میں) شک نہ کرسکیں، اور تاکہ وہ لوگ جن کے دلوں میں (نفاق کی) بیماری ہے اور کفار یہ کہیں کہ اس (تعداد کی) مثال سے اللہ کی مراد کیا ہے؟ اسی طرح اللہ (ایک ہی بات سے) جسے چاہتا ہے گمراہ ٹھہراتا ہے اور جسے چاہتا ہے ہدایت فرماتا ہے، اور آپ کے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور یہ (دوزخ کا بیان) اِنسان کی نصیحت کے لیے ہی ہے''۔ (طاہر القادری)

''اور ہم نے دوزخ کے داروغہ نہ کیے مگر فرشتے، اور ہم نے ان کی یہ گنتی نہ رکھی مگر کافروں کی جانچ کو اس لیے کہ کتاب والوں کو یقین آئے اور ایمان والوں کا ایمان بڑھے اور کتاب والوں اور مسلمانوں کو کوئی شک نہ رہے اور دل

کے روگی (مریض) اور کافر کہیں اس اچنبھے کی بات میں اللہ کا کیا مطلب ہے، یونہی اللہ گمراہ کرتا ہے جسے چاہے اور ہدایت فرماتا ہے جسے چاہے، اور تمہارے رب کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور وہ تو نہیں مگر آدمی کے لیے نصیحت''۔ (احمد رضا خان)

دوسرا ترجمہ درست ہے، مذکورہ آیت میں استیقان کو اہل کتاب سے متعلق بتایا گیا، اور اہل ایمان کے سلسلے میں استیقان کے بجائے ایمان کے زیادہ ہونے کی بات کہی گئی۔ قرآن مجید کے بیانات اہل کتاب کو یقین تو فراہم کر رہے تھے، مگر یقین آجانے کے بعد بھی ان کو یقین کرنے اور ایمان لانے کی توفیق نہیں مل رہی تھی۔ محض دل میں یقین کا ہو جانا ایمان وایقان نہیں ہے جب تک انسان اپنے ارادے سے ایقان وایمان کے عمل کو انجام نہ دے۔ دوسری طرف اہل ایمان جو ایقان وایمان کی منزل پر فائز ہیں ان کے ایمان وایقان میں اضافہ ہو رہا ہے۔

زیر گفتگو آیت کے سلسلے میں ایک بات اور قابل توجہ ہے کہ ترجمہ اس طرح کرنے کے بجائے کہ ''ہم نے ان کی گنتی کافروں کے لئے محض آزمائش کے طور پر مقرر کی ہے'' ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے کہ ہم نے ان کی گنتی کو کافروں کے لئے آزمائش بنا دیا''، یعنی اللہ نے وہ تعداد اس لئے نہیں رکھی کہ وہ آزمائش بن جائے، تعداد تو اللہ تعالی نے اپنی مشیت سے جتنی چاہی رکھی۔ البتہ اللہ کی طرف سے کرنا ایسا ہوا کہ اس وقت وہ تعداد ان کے لئے آزمائش بن گئی۔

(۳۰) وَإِذَا قِيلَ إِنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيهَا قُلْتُم مَّا نَدْرِي مَا السَّاعَةُ إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ۔ (الجاثیۃ:۳۲)

''اور جب تم سے کہا جاتا کہ اللہ کا وعدہ شدنی ہے، اور قیامت کے باب میں کوئی شک نہیں ہے، تو تم جواب دیتے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے، بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں، اور ہم اس کا یقین کرنے والے نہیں ہیں''۔ (امین احسن اصلاحی)

''اور جب کہا جاتا تھا کہ خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شک نہیں تو تم کہتے تھے ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہے۔ ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں اور ہمیں یقین نہیں آتا''۔ (فتح محمد جالندھری)

دوسرا ترجمہ درست ہے، اس آیت میں انکار کرنے والے یہ اعلان نہیں کر رہے ہیں کہ ہم آخرت پر یقین نہیں کرتے ہیں یا یقین نہیں کریں گے، بلکہ بڑے شاطرانہ انداز سے یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ ایسی چیز ہی نہیں ہے جس کا دل کو یقین ہو سکے، اور جب دل کو یقین نہ ہو تو ایمان کیسے لایا جائے۔ اس طریقہ سے کفار آخرت کے دعوے کو ہلکا کرنے اور یقین سے فروتر بتانے کی کوشش کرتے تھے، اللہ تعالی نے ان کی اس شرارت اور مکاری کو بے نقاب کیا ہے، اور اس کے سلسلے میں انہیں دھمکی دی ہے۔

(۴۲) إِن نَّظُنُّ إِلَّا ظَنًّا کا ترجمہ

سورہ جاثیہ کی مذکورہ بالا آیت کے اس ٹکڑے کا دو طرح سے ترجمہ کیا گیا ہے:

''ہم تو بس ایک گمان سا رکھتے ہیں''۔ (سید مودودی)

''بس ایک گمان ہے جو ہم کرتے ہیں''۔(امین احسن اصلاحی)

''ہم اس کو محض ظنی خیال کرتے ہیں''۔(فتح محمد جالندھری)

''ہم اُسے وہم وگمان کے سوا کچھ نہیں سمجھتے''۔(طاہرالقادری)

پہلے والے دونوں ترجموں میں لفظ ''ظـنـا'' کومفعول مطلق مانا گیا ہے۔جبکہ موخرالذکر دونوں ترجموں میں لفظ ''ظنا'' کودوسرا مفعول بہ مانا گیا ہے۔

سیاق کلام پرغور کیا جائے، اور یہ دیکھا جائے کہ منکرین آخرت کتنی شدت کے ساتھ نظریہ آخرت کی تردید کرتے تھے، تو دوسرا ترجمہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔منکرین آخرت قیامت کے تصور کوگمان کے کسی بھی درجہ میں قبول کرنے کو آمادہ نہیں تھے، کیونکہ یہ تو ان کی اس ہٹ دھرمی اور دوٹوک انکار کی روش کونقصان پہنچانے والی بات تھی جوانہوں نے تمام تر دلائل وبراہین کے مقابلے میں اختیار کررکھی تھی۔ وہ یہ نہیں کہتے تھے کہ انہیں قیامت کے آنے کا گمان ہے، وہ تو صاف صاف کہتے تھے کہ قیامت برپا نہیں ہوگی، وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ (سبا:۳) دوسری طرف سیاق کلام بھی یہی بتارہا ہے کہ مخاطب قیامت کے وقوع کے سلسلے میں شدید انکار اور استہزاء کا موقف اختیار کیے ہوئے ہے۔

ایک طرف اللہ یقین دلا رہا ہے کہ قیامت برحق ہے اور ضرور آئے گی، تو دوسری طرف منکرین کا جواب یہ ہے، کہ قیامت کیا ہے ہم جانتے نہیں، اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت ایک وہم اور گمان محض ہے، اس لیے کہ ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس سے قیامت کا یقین ہو سکے۔ بھولے پن کے لباس میں یہ جواب دراصل شدید قسم کے استہزاء اور انکار کی ایک شکل تھی۔ دوسرے بہت سارے ترجموں کے مقابلے میں فتح محمد جالندھری کے مذکورہ بالا ترجمہ سے اس پوری کیفیت کا صحیح اظہار ہوتا ہے۔

(۴۳) رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ کا ترجمہ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے اللہ نے ہوا کو مسخر کیا تھا۔اس کا تذکرہ قرآن مجید میں اس طرح کیا گیا ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ۔ (ص:۳۶)

اس آیت کا ترجمہ عام طور سے لوگوں نے حسب ذیل کیا ہے:

''تب ہم نے اس کے لیے ہوا کو مسخر کر دیا جو اس کے حکم سے نرمی کے ساتھ چلتی تھی جدھر وہ چاہتا تھا''۔(سید مودودی)

اس ترجمہ پر دو اشکال وارد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ أَصَـابَ کے معنی چاہنے کے نہیں بلکہ کسی نشانے یا ہدف پر پہنچنے کے ہوتے ہیں، گوکہ مفسرین اور اہل لغت نے بعض حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ فعل ارادہ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے۔لیکن وہ کوشش تکلف سے خالی نہیں لگتی، اور بہرحال اس لفظ کا اصل اور مشہور معنی تو وہ نہیں ہے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک دوسرے مقام پر بتایا گیا کہ جو ہوا حضرت سلیمان کے لیے مسخر کی گئی تھی وہ اتنی تیز رفتار ہوتی تھی کہ ماہ بھر کا سفر صبح میں ہی طے ہوجاتا تھا، اور ایک اور ماہ کا سفر شام تک طے ہوجاتا تھا۔

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ ۔(سبا:۱۲)دوسری جگہ صراحت ہے کہ عاصفہ یعنی بادتند کو مسخر کیا تھا،وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِيْ بَارَكْنَا فِيْهَا ۔(الانبیاء:۸۱)ظاہر ہے ایسی تیز رفتار بادتند کے لیے رُخاءً تو نہیں آسکتا ہے۔

مولانا امانت اللہ اصلاحی نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے:

''تو ہم نے اس کے لیے مسخر کر دیا ہوا کو، جو اس کے حکم سے چلتی اس طرح کہ جب وہ منزل پر پہونچ جاتا تو مدھم پڑ جاتی''۔

گویا حَيْثُ أَصَاب اس ترجمہ کے لحاظ سے رُخَاءً کا ظرف ہے۔جبکہ اوپر ذکر کیے گئے ترجمے میں حَيْثُ أَصَاب ظرف ہے تَجْرِيْ بِأَمْرِه کا۔

معلوم یہ ہوا کہ خدا کے حکم سے ہوا اس طرح حضرت سلیمان کی خدمت گزار ہوگئی تھی کہ جب روانہ ہوتے تو اتنی تیز رفتار سے چلتی کہ ماہ بھر کا سفر گھنٹہ بھر میں طے ہو جاتا،اور جب منزل پر پہنچ جاتے تو تابع دار گھوڑے کی طرح اس کی رفتار ہلکی ہو جاتی۔ایک گھوڑے سے یہ رویہ عجیب نہیں لگتا،کہ اس کی لگام شہ سوار کے ہاتھ میں ہوتی ہے،مگر ہوا اگر اس طرح کرے تو یقیناً بہت تعجب خیز بات ہے،اور اس کا ذکر خصوصی طور سے کرنے کی وجہ فوراً سمجھ میں آجاتی ہے۔ہوا کسی ایک رفتار سے نہیں چلے بلکہ اپنے دوش پر سوار شخص کی ضرورت اور خواہش کے مطابق تیز رفتار اور خراماں رفتار ہو جائے،یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے اللہ رب العزت کی طرف سے بہت زبردست نشانی تھی،اور بہت بڑا اکرام واعزاز تھا۔

(۴۴) والد اور ولد کا صحیح ترجمہ

لفظ والد کے اصل مفہوم اور مروجہ مفہوم میں ایک بنیادی فرق ہے،اس فرق کا لحاظ مترجمین کے یہاں نہیں ہوسکا۔عربی زبان میں جس طرح لفظ 'اب' باپ کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن 'ابوین' تغلیب کے طور پر ماں باپ دونوں کے لئے آتا ہے،اسی طرح 'والد' کا اطلاق دراصل ماں پر ہوتا ہے،کیونکہ ولد کا معنی جنا اور جنم دیا ہوتا ہے،یہ وہ کام ہے جسے عورت انجام دیتی ہے۔بطور تغلیب ماں باپ دونوں پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے،والد اصلا ماں کے لیے ہوتا ہے اور باپ کے لیے اصلا 'مولود لہ' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔قرآن مجید میں ہے:لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهُ بِوَلَدِه۔(البقرۃ:۲۳۳)

واضح رہے کہ یہاں اصل استعمال کی بات ہو رہی ہے۔شاعر کہتا ہے:

اذا والد منها تربّد ضرعها ... جعلت لها السكين احدى القلائد

(اساس البلاغة للزمخشری(۱/۱۵۵)

اس شعر میں حاملہ اونٹنی کے لیے لفظ 'والد' استعمال کیا گیا۔

علامہ فیروز آبادی اس لفظ کی حقیقت کی یوں تشریح کرتے ہیں:

ووَلَدَت تَلِدُ وِلاداً ووِلادةً والادَةً ولِدَةً ومَولِداً . وهي والِد وَوالِدَة . وشاة والد

وَوالِدَة۔(القاموس المحیط للفیروزآبادی)

حاصل کلام یہ ہے کہ قرآن مجید میں جہاں والد کا لفظ آیا ہے وہاں دیکھنا چاہئے، اور اگر کوئی واضح قرینہ رکاوٹ نہ بن رہا ہو تو والد کا ترجمہ یا تو ماں ہونا چاہئے یا ماں باپ دونوں ہونا چاہئے۔ قرآن مجید میں لفظ والد دو مقام پر آیا ہے، اور دونوں مقامات پر اگر باپ کے بجائے ماں باپ کیا جائے تو معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور ترجمہ لفظ کی حقیقت سے قریب رہتا ہے۔

وَاخْشَوْا يَوْماً لَّا يَجْزِيْ وَالِدٌ عَن وَلَدِهِ وَلَا مَوْلُوْدٌ هُوَ جَازٍ عَن وَالِدِهِ شَيْئاً۔ (لقمان:۳۳)

اس آیت کا ترجمہ کرتے ہوئے عام طور سے اردو مترجمین نے والد کا ترجمہ باپ کیا ہے:

''اور اس دن کا خوف کرو جس دن باپ اپنے بیٹے کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے گا اور نہ بیٹا اپنے باپ کا ذرا سا بھی نفع کرنے والا ہوگا''۔ (محمد جوناگڑھی)

انہوں نے ولد کا ترجمہ بھی بیٹے کیا ہے، حالانکہ ولد میں بیٹا اور بیٹی دونوں شامل ہوتے ہیں۔

آیت کے مذکورہ حصے کا ترجمہ اس طرح ہونا چاہئے:

''اور اس دن کا خوف کرو جس دن ماں باپ اپنی اولاد کو کوئی نفع نہ پہنچا سکیں گے اور نہ اولاد اپنے ماں باپ کو ذرا سا بھی نفع دینے والی ہوگی''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

بعض انگریزی مترجمین نے Father کے بجائے Parent کے لفظ کا استعمال کیا ہے۔ اسی طرح ولد کا ترجمہ son کے بجائے child کیا ہے جو لڑکے اور لڑکی دونوں کے لئے آتا ہے۔ یہ طریقہ بہت مناسب ہے۔

And fear a Day when the parent will not be able to avail the child in aught, nor the child to avail the parent.(Pickthall)

وَوَالِدٍ وَمَا وَلَدَ۔(البلد:۳)

اس آیت کے ترجمہ میں بھی عام طور سے مفسرین نے والد کا ترجمہ باپ کیا ہے۔

''اور قسم کھاتا ہوں باپ کی اور اس اولاد کی جو اس سے پیدا ہوئی''۔ (سید مودودی)

اس کا درست ترجمہ اس طرح ہو سکتا ہے:

''اور قسم کھاتا ہوں ماں باپ اور ان کی اولاد کی''۔ (امانت اللہ اصلاحی)

انگریزی کا حسب ذیل ترجمہ بھی صحیح مفہوم ادا کرتا ہے:

And (the mystic ties of) parent and child (Yousuf Ali)

خود مقسم علیہ یعنی لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِيْ كَبَدٍ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ماں تو یہاں ضرور مراد ہے، کیونکہ مشقت کے ساتھ جس تخلیق کی بات کہی گئی ہے اس کا تعلق ماں سے زیادہ نمایاں ہے کہ وہی ساری تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتی ہے۔ (جاری)